© rasailojaraid.com

اُردو شاعری اور تصوّف

غلام مصطفیٰ نعمانی

سورۃ آل عمران کی آیت ہے : لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ج وان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین ۝[1] یعنی "اللہ پاک نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں کا، جو پڑھتے ہیں ان پر آیتیں اس کی اور تزکیہ کرتے ہیں ان کا اور سکھاتے ہیں ان کو کتاب اور حکمت، اور وہ لوگ تو پہلے صریح گمراہی میں تھے"

اس آیت سے واضح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپؐ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب بھی فرماتے تھے۔ لیکن آپؐ کے بعد یہ کام آپؐ کے نائبین یعنی علماء اور صلحاء نے کیا۔ پھر اس مقصد کے لئے باقاعدہ مختلف سلاسل قائم ہوئے جو آج بھی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلے شخص جو صوفی کہلائے گئے وہ ابوہاشم کوفی تھے۔ جو سفیان ثوری کے معاصر تھے۔ بعض کے نزدیک پہلے صوفی جابر بن حیان کوفی تھے۔ یہ دونوں بزرگ دوسری صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ ان سے پہلے جو بزرگ اپنی زاہدانہ زندگی کے لئے خصوصیت رکھتے تھے ان کے لئے صحابی یا تابعی ہونا ہی سب سے بڑا شرف تھا۔ ان بزرگوں کے علاوہ جن بزرگوں نے تصوف پر شروع میں لکھا ہے ان میں جنید بغدادی (المتوفی ۲۹۷ھ)، ابو نصر سراج طوسی (المتوفی ۳۷۸ھ)، ابوبکر بخاری کلاباذی (اواخر چہارم صدی)، ابوالقاسم قشیری (المتوفی ۴۶۵ھ)، داتا گنج بخش لاہوری (المتوفی ۴۶۵ھ) خصوصی طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی (المتوفی ۲۶۱ھ) اور جنید بغدادی

---

[1] اسی سے ملتی جلتی آیت سورۃ الجمعہ میں بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے ذوق و وجدان کی بناء پر مسئلہ وحدۃ الوجود کا ذکر کیا تھا لیکن ان کے بعد محی الدّین ابن عربی (المتوفی ۶۳۸ھ) نے اس مسئلے کو ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا کر ایک فلسفہ بنا دیا[1] مگر اللہ پاک کا بے حد احسان ہے کہ اس نے ابن عربی سے پہلے ہی امام غزالی (المتوفی ۵۰۵ھ) سے یہ خدمت لے لی تھی کہ انھوں نے اسلامی عقائد کو صحیح اور اصلی صورت میں پیش کر کے تصوّف کو فلسفے کی غلامی سے بچانے کی راہ ہموار کر لی تھی۔ تاہم فارسی اور اُردو کے بیشتر شعراء نے وحدۃ الوجود ہی کے راگ الاپے اور "ہمہ اوست" کے مضامین پیش کئے۔ اس "ہمہ اوست" کے مسئلے کو حضرت مجددِ الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے "ہمہ ازوست" بنا دیا یعنی وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اشیاء نزدِ صوفیہ ظہوراتِ حق اند نہ عینِ حق۔ پس اشیاء از حق باشند نہ حق۔ پس معنی این کلامِ ایشان کہ ہمہ اوست ہمہ ازوست باشد کہ مختارِ علمائے کرام است و نزاع درمیانِ علمائے کرام و صوفیۂ عظام فی الحقیقۃ ثابت نہ باشد۔ مآلِ قولین یکے بود۔ این قدر فرق است کہ صوفیہ اشیاء را ظہوراتِ حق می گویند و علماء ازیں لفظ نیز تحاشی می نمایند از جہتِ تحرّز نمودن از توہّم حلول و اتّحاد۔"[2]

لیعنی صوفیہ کے نزدیک اشیاء، حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں، نہ کہ حق تعالیٰ کا عین۔ پس اشیاء حق تعالیٰ سے ہیں، نہ کہ وہ خود حق تعالیٰ ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام ہمہ اوست کے معنی ہمہ ازوست ہوں گے جو کہ علمائے کرام کے نزدیک مختار ہیں اور علماء و صوفیہ کے درمیان حقیقت میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ دونوں کے اقوال کا مقصد ایک ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیہ، اشیاء کو حق تعالیٰ کے ظہورات کہتے ہیں اور علماء اس لفظ سے بھی اجتناب کرتے ہیں تاکہ حلول اور اتحاد کا وہم بھی پیدا نہ ہو سکے[3] اس بیان سے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں "مباحث و مسائل" (صفحہ ۲۰) از استاذی پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم (دہلی ۱۹۶۸ء)

[2] مکتوبات۔ دفتر دوم۔ مکتوب ۴۴ (مکتوبات ۳۱-۹۷-۲۶۶ دفتر اوّل بھی دیکھیں۔)

[3] ابن عربی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور تمام اشیاء اسی ایک وجود کی تجلّیات اور مظاہر ہیں۔ وجودِ حقیقی اور کائنات میں ذات و صفات کی نسبت ہے اور چونکہ صفات عین ذات ہیں اس لئے کائنات بھی حق تعالیٰ سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ سب وہی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمہ اوست کے نظریے کو مردود نہیں کہا بلکہ اس کی تاویل کی ہے اور اسے محمود سمجھا ہے، تاہم ان کے نزدیک وحدۃ الشہود یعنی ہمہ ازوست ہی مقصود ہے۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول سے وحدۃ الوجود کے نظریے کی تائید نہیں ہوتی۔

صوفیہ کے ان نظریات اور خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے اعمال واشغال کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ وہ تمام رذائل یعنی بغض، حسد، کینہ، غیبت، ظلم، نخوت، ریا وغیرہ سے حد درجہ پرہیز کرتے ہیں اور فضائل مثلاً تواضع، خوش خلقی، صدق (یعنی ظاہر و باطن کا یکساں ہونا)، ایثار، رحم، تقویٰ، شریعت کی پابندی وغیرہ پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، شکر، خوف، رجاء، اخلاص، احسان، توکل، تسلیم و رضا، دنیا سے بے رغبتی، استغناء وغیرہ اُن کے خصوصی امتیازات ہیں جن سے ان کی زندگی عبادت ہے۔ البتہ مختلف صوفیہ کے یہاں ان کی خصوصی اصطلاحات بھی ہیں۔ مثلاً حال و مقام، جمع و تفرقہ، جمع الجمع، تلوین و تمکین، سُکر و صحو، نفی و اثبات وغیرہ۔ پھر بعض بزرگوں کی بھی چند اصطلاحات مخصوص ہیں۔ مثلاً نقشبندیہ بزرگوں کے یہاں یہ اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ (۱) ہوش در دَم (۲) نظر بر قدم۔ (۳) سفر در وطن (۴) خلوت در انجمن (۵) یاد کرد (۶) بازگشت (۷) نگہداشت (۸) یاد داشت۔ (۹) وقوفِ زمانی (۱۰) وقوفِ عددی، اور (۱۱) وقوفِ قلبی۔

تصوّف اور متصوّفین کے اس اجمالی تذکرے کے بعد اب اُردو شعراء کے متصوّفانہ کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو شعراء میں بہت کم ایسے تھے جو صحیح معنی میں صوفی تھے۔ ورنہ اکثر شعراء نے "مسائل تصوف" صرف "بیان" کو وقیع بنانے کے لئے استعمال کئے ہیں، کیونکہ نہ تو اُن کی زندگی زاہدانہ تھی اور نہ اُن کا کردار متصوّفانہ تھا۔

اُردو کے پہلے باکمال شاعر وَلی (المتوفی ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) تھے۔ اُن کا شعر ہے:

(گزشتہ صفحہ سے آگے) انھوں نے کہا ہے کہ "سبحان من خلق الاشیاء و ھو عینھا" (پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو پیدا کیا اور وہ خود عین اشیاء ہے)۔ اور "الرب حق والعبد حق فنما ادری من المکلف" (خدا بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ مکلف کون ہے؟)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعدِ شاہِ نجفؓ، ولی اللہ　　پیرِ کامل علی رضا پایا

اس شعر میں ولیؔ نے اپنا نام ولی اللہ بتایا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اے ولی اللہ، شاہِ نجف یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد مجھے پیرِ کامل علی رضا کی ذات میں نظر آیا۔ یہ علی رضا (المتوفی ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرّہ کے پوتے علامہ فرخ شاہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) کے صاحبزادے تھے۔ روضۃ القیوم (۱/۲۹۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علی رضا، حضرت علامہ فرخ شاہ (ابن خواجہ محمد سعیدؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے صاحبزادے ہونے کے باوجود شریعت کے غیر پسندیدہ علوم یعنی علومِ سیمیا، کیمیا، ریمیا وغیرہ اور نغمہ و سماع سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں تائب ہو کر وہ اپنے والد صاحب سے رجوع ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ وہ گجرات چلے گئے تھے اور وہیں ان کے پانچ صاحبزادے بھی مقیم ہوئے۔ ولیؔ کا مذکورہ بالا شعر ظاہر کرتا ہے کہ ولیؔ نے شیخ علی رضاؒ سے ان کے بزرگوں کی طرح نقشبندیہ سلسلے میں بیعت نہیں کی تھی کیونکہ اس سلسلے کے پیش رو حضرت سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور اس سلسلے کے علاوہ جو دوسرے سلسلے ہیں ان کے پیش رو "شاہِ نجف" یعنی سیّدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے۔ ولیؔ نے ۱۱۱۲ھ میں گجرات سے دہلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں شاہ سعد اللہ گلشن، (المتوفی ۲۱ رجادی الاوّل ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء[1]) سے ملے۔ کیونکہ یہ گلشنؔ، ولیؔ کے پیر شیخ علی کے چچا یعنی خواجہ

---

[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام (سروِ آزاد) میں گلشن کی وفات کی یہی تاریخ لکھی ہے لیکن سفینۂ خوشگو (دفترِ ثالث) میں ۱۱۴۰ھ ہے۔ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سعد اللہ گلشنؔ حضرت شاہ گلؒ کے مرید تھے۔ راقم الحروف نے شاہ گل کے مکتوبات "گلشنِ وحدت" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کئے تھے۔ اس نام میں بھی پیر اور مرید دونوں کے تخلص آجاتے ہیں۔ یہ مکتوبات ان کے خلیفہ شیخ محمد مراد کشمیری نے جمع کئے تھے جس کے آخر میں ولیؔ کے پیر شیخ علی رضا کے والد علامہ فرخ شاہ کے بھی دو مکتوبات ہیں اور ایک اجازت نامہ بھی ہے، جو شیخ علی رضا نے شیخ مراد کو دیا تھا۔ ولیؔ کا یہ شعر غالباً اسی محمد مراد کے متعلق ہے:

مقصودِ دل ہے اس کا خیال اے ولیؔ مجھے　　جو مجھ زباں کا وِرد محمد مراد ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبدالاحد وحدت المعروف "شاہ گل" (المتوفی ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) کے (مرید اور) شاگرد تھے اور ولی بھی شاہ گلشن کی شاگردی اختیار کر چکے تھے۔ وہ اپنے فارسی رسالہ نورالمعرفت میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "مصنفِ ایں عبارت کہ بہ یمنِ ثنا پردازیِ بزرگان' بہ خطابِ ولی سرفراز است واز شاگردانِ زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز ....." کہا جاتا ہے کہ دہلی میں ولی نے شاہ گلشن کے مشورے سے اپنی دکنی شاعری کو فارسی کے شعرائے متاخرین کے انداز پر لکھنا شروع کیا تھا اور نمونے کے لئے خود شاہ گلشن نے ولی کو ایک غزل بھی لکھ کر دی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں　　بے تکلف صفحۂ کاغذ' یدِ بیضا کروں[1]

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ "شاہ گل" کی رعایت سے ان کے شاگرد کا تخلص گلشن تھا اور گلشن کی رعایت سے اُن کے شاگرد عندلیب تھے اور عندلیب کی رعایت سے ان کے صاحبزادے خواجہ میر درد اور میر اثر تھے۔

ولی کی پہلی غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

کیتا ہوں ترے ناؤں کوں میں وردِ زباں کا　　کیتا ہوں ترے شکر کوں عنواں بیاں کا

اس شعر میں "بسم اللہ" اور سورۃ الفاتحہ "الحمد للہ" کا اشارہ ہے۔ پھر نعتیہ شعر اور خلفائے راشدین رض کی منقبت کا شعر بھی "تعریف" میں ہے۔ یعنی:

جس گرد اُپر پانو رکھے تیرے رسولاں　　اس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

مجھ صدق و ظرف عدل سوں لے اہلِ حیا دیکھ　　تجھ علم کے پردے میں نہیں رنگ گماں کا

نعتیہ شعر میں مولانا جامی کے شعر کی طرف اشارہ ہے:

(صفحہ گزشتہ سے آگے) اور گمان ہوتا ہے کہ ولی کا یہ شعر خواجہ عبدالاحد وحدت المعروف "شاہ گل" کے متعلق ہے۔

وحدت کے گلستاں کا چمن حسن ہے تیرا　　پھولا ہے تیں بیچ بہارِ گل و نرگس

[1] طبقات الشعراء مؤلفہ قدرت اللہ مراد آبادی۔ بحوالہ کلیاتِ ولی مرتبہ مولانا احسن مارہروی، ضمیمہ ۲۔ صفحہ ۸۷ ح۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہ زمینے کہ نشان کفِ پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اور منقبت والے شعر میں صدق، عدل، حیا، اور علم کے الفاظ سے خلفائے راشدینؓ کی طرف اشارہ ہے۔ اس شعر کے بعد ولیؔ نے تصوّف کا نظریہ پیش کیا ہے کہ :

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی — یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

نظریۂ وحدت الوجود کو زیادہ واضح الفاظ میں اس شعر میں پیش کیا ہے :

حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالبِ عشق ہوا صورتِ انساں میں آ

دوسرے متصوّفانہ اشعار یہ ہیں :

ہزار بلبلِ مسکیں کی قید باقی ہے — مقیم ہے چمنِ حسن میں بہار ہنوز

مسندِ گل، منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ہوا نئیں جب تلک خالی الیں سوں — گرفتاراں میں ہرگز معتبر نئیں

ولیؔ اس کی حقیقت کیوں کروں بوجھوں — کہ جس کا بوجھنا حدِ بشر نئیں

ولیؔ کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی (المتوفی ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۴ء) ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کی ایک مشہور غزل خالص متصوّفانہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

خبرِ تحیّرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

وُہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا — کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی یوں ہی دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حُسن کا اثر اس قدر سے عیاں ہوا — کہ نہ آئینے میں جِلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراجؔ کو — نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خبری رہی

یہ غزل کس قدر وجد آفریں ہے ! گویا سراجؔ کے مزاج اور مذاق کی حقیقی آئینہ دار ہے۔

سراجؔ کے بعد حضرت مظہرِ جانِ جاناں شہیدؔ (المتوفی ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء) ایک باکمال صوفی شاعر ہوئے ہیں۔ ان کا فارسی دیوان، صحیح معنی میں عشق نامہ ہے۔ اُردو میں اُن سے بہت کم اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار جو اُن کے متصوّفانہ مزاج کے مطابق ہیں تذکروں میں اس طرح مذکور ہیں :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گزر گئے ہیں دین اور دنیا سے تس پر ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے مینا لگا ہے جب سے تی مجھ بے نوا کے ہات
مرا جلتا ہے دل اُس بلبلِ بے کس کی غربت پر کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا
تجلی گر تری پست و بلند اُن کو نہ دکھلاتی فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی؟

حضرت مظہر کا تعلق قادریہ سلسلے سے کم، لیکن نقشبندیہ سلسلے سے زیادہ تھا۔ جس میں ایسی منزلیں آتی ہیں کہ دین اور دنیا بھی صرف اللہ ہی کے لئے وقف ہو جاتی ہے اور محبوبِ ازلی، وراء الوراء ثم وراء الوراء نظر آتا ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ :

گزر گئے ہیں دین اور دنیا سے تس پر - ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

یقین، تاباں، حزیں، بیاں وغیرہ بکثرت شعراء نے حضرت مظہر سے استفادہ کیا[1] اور ان کے رنگ کو کسی حد تک اپنایا۔ ان کے بعد سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید نے جہاد کی تحریک شروع کی۔[2] اور یہ دونوں بزرگ بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے لیکن قوم میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جو سلطان[3] ٹیپو شہید (۱۷۹۹ء) کی صدائے بازگشت تھی اور یہ سب کے سب نقشبندی (سرہندی) سلسلے سے وابستہ تھے۔

---

[1] یقین بھی اسی طرح کہتے ہیں :

یار کو منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر منزلِ مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے

[2] مولانا حسین احمد مدنی نے نقش حیات (جلد دوم۔ صفحہ ۱۲-۳- دہلی ۱۹۵۴ء) میں یہ عجیب بات لکھی ہے کہ "جب سید صاحب (سید احمد شہید) کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی"

[3] سلطان ٹیپو اور اُن کے والد حیدر علی کا عَلَم انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے جس پر نقشبندی اور قادری بزرگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ دیکھئے

DR. GRAHAME BAILEY'S "STUDIES IN NORTH INDIAN LANGUAGES" (LONDAN, 1938, PP. 186-188)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواجہ میر درؔد (المتوفی ۱۱۹۹ھ) حضرت بہاؤالدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۹۱ھ) کی اولاد میں سے تھے اور ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب، حضرت مجددؔ الف ثانیؒ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کے پرپوتے محمدؔ زبیرؒ[1] (ابن محمد نقشبند ثانیؒ ابن خواجہ محمد معصومؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ) سے بیعت تھے اور شاہ سعد اللہ گلشنؒ سے بھی مستفیض تھے۔ جو شاہ گلؒ (یعنی عبدالاحدؒ ابن محمد سعیدؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے مرید تھے (ان کا ذکر اوپر آچکا ہے)۔ اس طرح خواجہ میر درؔد، نقشبندی مجددی مسلک رکھتے تھے لیکن انھوں نے عام شعری روایات کے مطابق وحدۃ الشہود کے بجائے وحدۃ الوجود ہی کا نظریہ پیش کیا۔ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں کہ وحدۃ الوجود والوں کا عقیدہ ہے کہ وجودِ حقیقی صرف ایک ہے اور جب تک یہ وجود، مرتبۂ لاتعیّن یا مرتبۂ غیب میں تھا (جسے عالم بیرنگی بھی کہتے ہیں) تو تمام اعیان اور اسماء اس میں گم تھے۔ لیکن جب یہ وحدت، لاتعیّن سے تعیّن یعنی کثرت کی طرف مائل ہوتی ہے تو اسی کو کائنات یا عالم کہتے ہیں، تاہم یہ وحدت، کثرت سے جدا نہیں ہے اور مخلوق اپنے خالق سے الگ وجود نہیں رکھتی اور وہ ضرور اپنے خالق سے مل جائے گی۔ خواجہ میر درؔد کا کلام، تمام وکمال، اسی وجودیہ مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً :-

مدرسہ یا دیر تھا، یا کعبہ یا بُت خانہ تھا ۔۔۔ ہم سبھی مہمان تھے، واں تو ہی صاحب خانہ تھا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا ۔۔۔ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

مرتبۂ لاتعین سے جدائی جس کو خودی یا ہوش کہتے ہیں، ہستیِ ماسوا کی ذمہ دار ہے جو مثلِ شرر ناپائدار ہے - درؔد کہتے ہیں :

کم فرصتی نے ہستی بے اعتبار کی ۔۔۔ شرمندہ تیرے آگے اسے اے شرر کیا

برہم کہیں نہ ہو گل و بلبل کی آشتی ۔۔۔ ڈرتا ہوں آج باغ میں وہ تندخو گیا

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں ۔۔۔ گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

از بسکہ ہیں محوِ لاتعیّن ۔۔۔ ہر جا بے اختیار ہیں ہم

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز ۔۔۔ ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

صوفیہ کا مشہور قول ہے کہ ؎ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

---

[1] مقدمۂ دیوان درؔد (نظامی پریس) از نواب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دردؔ بھی اپنے انداز میں کہتے ہیں :-

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا　　پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اُس نے جو گیا

حجابِ رخ یار تھے آپ ہی ہم　　کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا　　پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

اُن نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں　　پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

دردؔ کے معاصرین اور متاخرین میں بہت سے شعراء نے تصوّف کے مضامین نظم کئے ہیں لیکن وہ محض رسماً تھے اور حقیقت نگار شعراء نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھے۔

بہادر شاہ ظفرؔ (المتوفی ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) نے حضرت شاہ فخر الدّین علیہ الرحمۃ[1] (المتوفی ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء) کو بچپن میں

---

[1] شاہ فخر الدینؒ کے ایک مرید شاہ محمدی بیدارؔ بھی تھے جو خواجہ میر دردؔ کے شاگرد تھے۔ وہ بھی وحدۃ الوجود کے مضامین نظم کرتے تھے۔ مثلاً :-

ہم تو ہر شکل میں یاں آئینہ خانے کی طرح　　آپ آتے ہیں نظر سیر جدھر کرتے ہیں

راہ پاتے ہیں وہی انجمنِ وحدت میں　　شمع کی طرح سے جو سر سے گزر کرتے ہیں

دامن کو نہ پہنچے تیرے اب تک　　ہر چند غبار ہو گئے ہم

مرزا جعفر علی حسرتؔ (المتوفی ۱۲۱۰ھ) بھی تصوف کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بعض اشعار میں بڑا درد پایا جاتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

شبنم کی مثال اس چمن میں　　شب آئے تھے ہم، سحر گئے ہم

کل روتے ہوئے جو اتفاقاً　　حسرتؔ کے مزار پر گئے ہم

پڑھتا تھا یہ شعر وہ تہِ خاک　　بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم

واماندوں پہ دیکھئے کہ کیا ہو　　اپنا تو نباہ کر گئے ہم

اسی طرح نظیر اکبر آبادی (المتوفی ۱۲۴۶ھ) کے یہاں دنیا کی بے ثباتی پر کئی نظمیں ہیں۔

ع　سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بہت مشہور ہے۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ ایک غزل میں اس طرح ہے :

تنہا نہ اسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان　　ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھا تھا اور اسی وقت سے ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک غزل میں مقطع ہے :۔

اے ظفرؔ میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں　　لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

جن مصائب سے بہادر شاہ گزرے ہیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ ہر طرح مجبور ہو چکے تھے اور اس قدر مایوس تھے کہ انہیں سلطان ٹیپو (المتوفی ۱۷۹۹ء) کے متعلق بھی یوں کہنا پڑا کہ :۔

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفرؔ　　فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

ظفرؔ اپنی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں شعر و شاعری اور تصوف ہی کو اپنا مشغلہ بنانے پر مجبور تھے۔ ان کے چند متصوفانہ اشعار یہ ہیں :۔

جس کو کہ ڈھونڈھتا ہوا میں ہر کہیں گیا　　دل ہی میں تھا مرے وہ مجھے مل یہیں گیا
تنگ تھا وسعت سے جس کے عرصۂ ارض و سما　　جی میں کیونکر اے دلِ آدم سمٹ کر آ گیا

وجودی نظریہ بھی پیش کرتے ہیں کہ :۔

عالمِ صورت میں تو میں صورتِ آدم میں ہوں　　عالم معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

غالبؔ کی طرح وہ بھی سازِ "انا البحر" چھیڑتے ہیں کہ :۔

مل گیا دریا میں جب قطرہ تو دریا ہو گیا　　جزو جو کُل میں ہوا گُم، جزو سے وہ کُل بنا

ایک غزل میں شروع سے آخر تک وحدۃ الوجود کے راگ الاپے ہیں :۔

کہیں میں غنچہ ہوں، وا شد سے اپنے خود پریشاں ہوں　　کہیں گوہر ہوں اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں
کہیں میں ساغرِ گل ہوں، کہیں میں شیشۂ مُل ہوں　　کہیں میں شور قلقل ہوں، کہیں میں شورِ مستاں ہوں
کہیں میں جوشِ وحشت ہوں، کہیں میں محوِ حیرت ہوں　　کہیں میں آبِ رحمت ہوں، کہیں میں داغِ عصیاں ہوں

اسی طرح ان کے اور بھی اشعار ہیں۔

امیر مینائیؔ (المتوفی ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) حضرت مخدوم شاہ بینا رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں تھے اسی لئے زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھے۔ ان کے عاشقانہ کلام میں جگہ جگہ تصوف کی چاشنی موجود ہے۔ وحدۃ الوجود ان کا مسلک تھا اور اسی مسلک کو وہ اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

کونین میں ہے جلوۂ حسنِ جمالِ دوست　　ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی ادھر بھی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفی واثبات سے متعلق فرماتے ہیں :۔

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا　　لے عالم آشنا ہو ترا آشنا ہوا

کنتُ کنزاً مخفیاً والے قول کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :۔

حیا تو اس کو بٹھائے ہزار پردے میں　　مگر جو بیٹھنے دے شوق، خودنمائی کا

المجاز قنطرۃ الحقیقت بھی صوفیہ ہی کا قول ہے۔ امیر اپنے انداز میں اس طرح اس کا ذکر کرتے ہیں :۔

جاتا ہوں اس لئے صنم بے وفا کے پاس　　پہنچا جو اس کے پاس وہ پہنچا خدا کے پاس

امیر بھی عام صوفیہ کی طرح اپنی ہستی کو فنا کرنا ہی بقا سمجھتے ہیں اور اسی نزول کو اپنا عروج قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

غافل، نزول ہی تو کمالِ عروج ہے　　خاکِ فنا ہی منزلِ آبِ بقا ہوئی

وہ اپنی فنا کی کیسی اچھی توجیہ و تاویل کرتے ہیں :۔

گل خود تھے بے ثبات گلستانِ دہر میں　　گلچیں غریب مفت میں بدنام ہوگیا

محسنؔ کاکوروی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) شروع ہی سے صوفی گھرانے کی تربیت سے مستفیض رہے اور فنافی الرسولؐ کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ ان کے کلام میں اکثر اسی عشق کی سرشاریاں نظر آتی ہیں، بلکہ ان کی تشبیہات و استعارات بھی تصوف کی مصطلحات سے آراستہ ہیں۔ ان کی مثنوی "صبح تجلی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

سالک ہے چمن میں نہر موزوں　　مجذوب ہے شاخ بیدِ مجنوں

ہے صوفیِ صاف دل صنوبر　　تحریکِ نسیم، حالت آور

ہر تخم بہ خلوت آرمیدہ　　ہر ایک ثمر خدا رسیدہ

ابدال ہیں برگ و نخل او تاد　　ہے نعم العبد سرو آزاد

خدمت میں بہار کی صبا ہے　　سبزہ، سنبل کا بالکا ہے

سجادہ بدوش لالہ یکسو　　یکسو شب زندہ دار شبو

ہے استغراق نیلوفر کو　　پاسِ انفاس ہے سحر کو

وحدت ہے چمن میں مغز تا پوست　　صادق ہے بہار پر ہمہ اوست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غنچہ نہ رہا تو گل ہوا ہے ۔ واصل ہے جسے یہاں فنا ہے
کہتا ہے اشارۃً لحد کا لو ۔ موتوا من قبل ان تموتوا

ایسی اصطلاحات محسنؔ کے کلام میں متعدد مقامات پر نظر آتی ہیں ۔

اسمٰعیلؔ میرٹھی (المتوفی ۱۳۳۵ھ ۱۹۱۷ء)، حضرت غوث علی شاہ پانی پتی (المتوفی ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء) کے مرید تھے اور امیرانہ زندگی کے باوجود، فقیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کی نظمیں اِس دَور کے سبھی لوگوں نے اپنے بچپن میں پڑھی ہوں گی۔ ان کی نظم "شمع ہستی" بھی ان کے زاہدانہ مشرب سے تعلق رکھتی ہے۔ غزلیات میں بھی جگہ جگہ یہی رنگ نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا ۔ جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اک مکاں نکلا

المجاز قنطرۃ الحقیقۃ، صوفیہ کا مشہور قول ہے۔ اسمٰعیلؔ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ :-

کھولا ہے مجھ پہ سرِّ حقیقت، مجاز نے ۔ یہ پختگی صلہ ہے خیالاتِ خام کا

وحدۃ الوجود سے متعلق فرماتے ہیں :-

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں ۔ ہے یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک "عاشقِ رسولؐ" یعنی مولانا احمد رضا خان بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء) کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ جن سے ہمارے ادباء نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے۔ حالانکہ یہ غالباً واحد عالمِ دین ہیں جنہوں نے نظم و نثر دونوں میں اُردو کے بے شمار محاورات استعمال کئے ہیں اور اپنی علمیت سے اُردو شاعری میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یہاں ہم اُن کے صرف متصوفانہ کلام کے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

وہ چونکہ شاہ آلِ رسول مارہروی (المتوفی ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء) کے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے اس لئے "عشقِ رسولؐ" ہی کو اصل تصوف سمجھتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں :-

راہِ عرفاں سے جو ہم نادیدہ رو محرم نہیں ۔ مصطفیٰؐ ہیں مسندِ ارشاد پر کچھ غم نہیں

ایک نعتیہ غزل میں کہتے ہیں :-

گر آنکھ ہوں تو ابر کی چشمِ پُر آب ہوں ۔ دل ہوں تو برق کا دلِ پُر اضطراب ہوں
کیوں نالہ سوز سے کروں، کیوں خونِ دل پیوں ۔ سیخِ کباب ہوں نہ میں جامِ شراب ہوں
دل بستہ بے قرار، جگر چاک، اشک بار ۔ غنچہ ہوں، گل ہوں، برقِ تپاں ہوں، سحاب ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک غزل میں "محاسبۂ نفس" اس طرح کیا ہے :۔

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے — سونے والو جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے
آنکھ سے کاجل صاف اڑا لیں یاں وہ چور بلا کے ہیں — تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے
یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا — ہائے مسافر دم میں نہ آنا، مت کیسی متوالی ہے
سونا پاس ہے سونا بن ہے سونا زہر ہے اٹھ پیارے — تو کہتا ہے نیند ہے میٹھی تیری مت ہی نرالی ہے
جگنو چمکے، پتا کھڑکے، مجھ تنہا کا دل دھڑکے — ڈر سمجھائے کوئی پون ہے یا اگیا بے تالی ہے
بادل گرجے، بجلی تڑپے، دھک سے کلیجا ہو جائے — بن میں گھٹا کی بھیانک صورت کیسی کالی کالی ہے
پاؤں اٹھا اور ٹھوکر کھائی، کچھ سنبھلا پھر اوندھے منہ — مینہ نے پھسلن کر دی ہے اور دھر تک کھائی نالی ہے
پھر پھر کر ہر جانب دیکھوں کوئی آس نہ پاس کہیں — ہاں اک ٹوٹی آس نے ہارے جی سے رفاقت پالی ہے
تم تو چاند عرب کے ہو پیارے، تم تو عجم کے سورج ہو — دیکھو مجھ بے کس پر شب نے کیسی آفت ڈالی ہے

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی (المتوفی ۱۹۳۲ء) اردو کے ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کا دیوان حیدرآباد (دکن) سے ۱۹۵۸ء میں چھپ چکا ہے۔ چونکہ آپ قادری سلسلے میں حضرت حاجی وارث علی شاہؒ کے مرید تھے اس لئے جذب و مستی سے بھی تعلق تھا اور ان کا پورا کلام وحدۃ الوجود کے نظریہ پر محیط ہے۔ صرف ایک غزل سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :۔

ازل جس بے نشاں کا نام ہے اس کا نشاں میں ہوں — نہاں خانے سے جو نکلا ہے وہ جلوہ عیاں میں ہوں
اگر بندہ کہوں خود کو تو خود کو غیر حق جانوں — خدا بھی کہہ نہیں سکتا کہ حاجب درمیاں میں ہوں
کہاں تک بات کو تولوں کہاں تک کچھ نہ میں بولوں — میں اپنا بھید کیوں کھولوں کہ اپنا راز داں میں ہوں
نظر ہے اپنے باطن پر تو مطلق ہوں میں سر تا سر — مقید ہو کے کہتا ہوں کہ میں کیا ہوں کہاں میں ہوں
جہاں منظور ہے جیسا وہاں ظاہر ہوں میں ویسا — مکیں کیسا؟ مکاں کیسا؟ زمیں میں ہوں زماں میں ہوں
ہوا ہوں ابر ہوں بادہ ہوں میں ساقی ہوں میکش ہوں — سبو ہوں جام ہوں میخانہ ہوں پیر مغاں میں ہوں
ظہور بے مثالی ہے ہر اک ذرے میں عالم کے — جہاں ہوں بے نظیر و بے مثال و بے نشاں میں ہوں

اصغر گونڈوی (المتوفی ۱۹۳۶ء) حضرت شاہ عبد الغنی منگلوریؒ سے بیعت تھے اور شروع ہی سے تصوف کے رنگ میں لکھتے تھے۔ نشاطِ روح اور سرودِ زندگی کے اکثر اشعار متصوفانہ ہیں جن میں نفی و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اثبات کے مضامین زیادہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جنونِ عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رخ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں، مجھے اب اس کی خبر نہیں ہے

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے
یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

وحدۃ الوجود کے نظریے کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

وہ اہل ظاہر سے توقع نہیں رکھتے کہ ان میں کوئی عشق کا راز سمجھ سکے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

اہل حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے
ایسا کہ بتکدے کا جسے راز ہو سپرد

ان کا یقین ہے اور عام صوفیہ کا بھی یقین ہے کہ اپنی ہستی کو فنا کر دینا ہی عین تصوف ہے اصغر بڑی خوبی سے اس یقین کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

صوفیہ کا قول ہے کہ اللہ پاک کی یہ مراد تھی کہ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت خلقاً۔ یعنی میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس لئے میں نے خلق کو پیدا کیا۔ اصغر اپنے انداز میں کہتے ہیں:

عشق کی فطرت ازل سے حسن کی منزل میں ہے
قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

تاہم اصغر کا اعتراف ہے کہ:۔

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

علامہ محمد اقبالؒ (المتوفی ۱۹۳۸ء) ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجۂ نقشبندؒ اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدینؒ (جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔"[1] پھر وہ اپنے ملفوظات میں صاف طور پر فرماتے ہیں۔ بیدل

---

[1] اقبال نامہ۔ صفحہ ۴۷-۴۶ (حصہ اول)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے۔ اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے الفت ہے ۔۔۔ نقشبندیہ سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی رح سے بیدل کی عقیدت کی بنیاد یہی ہے۔ نقشبندی مسلک، حرکت اور روحانیت پر مبنی ہے[۱]" اسی لئے اقبال نفیِ خودی کے نہیں، بلکہ اثباتِ خودی کے قائل ہیں اور حیات کے لئے کشمکشِ حیات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں خودی سے مراد تعیینِ ذات اور عرفانِ نفس ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آگے بڑھے اور راہِ عمل اختیار کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل خوش آئی اسے محنتِ آب و گل
یہ ثابت بھی اور سیار بھی عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی (ساقی نامہ)

پیامِ مشرق کا ایک قطعہ ہے کہ :۔

دما دم نقشہائے تازہ ریزد بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

بہر حال اقبال نے عشق اور وجدان پر زور دیا ہے جسے عقلی استدلال کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

وہ فلسفے کے ذریعے تصوف تک پہنچتے ہیں اور رومی کو اس لئے اپنا مرشد مانتے ہیں کہ انھوں نے سعی و عمل پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ :

ع کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی

چنانچہ اقبال ایسے تصوف اور ایسے صوفی کو پسند کرتے ہیں جو عمل کے لئے تڑپا دے اور بے عملی سے نفرت پیدا کرا دے۔

---

[۱] ملفوظاتِ اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی۔ لاہور۔ صفحہ ۱۲۲۔ تفصیل کے لئے دیکھیں راقم الحروف کا مضمون "اقبال کا نظریۂ شعر و ادب" (تحقیقی جائزے۔ سکھر ۱۹۶۸ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

فانؔی بدایونی (المتوفی ۱۹۴۱ء) کے کلام میں وحدۃ الوجود، مقامِ انسان، مقصدِ آفرینش، جبر و اختیار، فقر، فنا، بقا، استغناء، عشق میں ناکامی وغیرہ مضامین عموماً ملتے ہیں اور ایسی شاعری ان کی محبت کی ناکامی، معاش کی تنگی، اعزاء کی بدسلوکی وغیرہ کی وجہ سے تھی۔ گویا قنوطیت اور فنائیت، فانؔی کی شاعری کی اساس ہے۔[1] وحدۃ الوجود کے نظریے کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:-

صور و منصور و طور، ارے توبہ　　ایک ہے تیری بات کا انداز

محوِ فروغِ ذات ہوں، بے خبرِ صفات ہوں　　کوئی ہو شمعِ بزم کیا، شمعِ سرِ مزار کیا

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود، اللہ رے وہم　　بلبلہ ہے عینِ دریا، پھر بھی دامن چیدہ ہے

قرآن پاک میں ہے: وھو معکم اینما کنتم (اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو)۔ اس مضمون کو فانؔی اس طرح بیان کرتے ہیں:-

وہ یہیں ہیں جو وہ کہیں بھی نہیں　　آیئے دل میں جستجو تو کریں

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے　　ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

ھو سبحانہٗ وراءَ الوراءِ ثم وراء الوراء ہمارے صوفیہ کا قول ہے۔ فانؔی کہتے ہیں:-

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے　　کہ تو یہاں نہیں ملتا، وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی　　وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ　　بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

تعینات اور مظاہرات میں انسان سب سے افضل و اکمل ہے۔ لیکن پھر بھی موہوم ہے۔ فانؔی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں:-

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا　　ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں "مباحث و مسائل" از استاذی ضیاء احمد بدایونی مرحوم۔ صفحہ ۳۸۳ - ۴۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوفیہ کا مشہور قول ہے : من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا) فانیؔ کہتے ہیں:

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب　　آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ　　آئینہ اٹھا حسنِ خود آرا سے گزر جا

ترکِ خودی ہے ہوشِ عشق، درکِ خودی ہے جوشِ عشق　　خود نشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

پھر بھی وہ زندگی کو ایک عقدۂ لاینحل کہتے ہیں:-

اک معمّا ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

اسی لئے وہ سب کچھ تقدیر ہی کو سمجھتے ہیں:

حسنِ تدبیر نہ رسوا ہو جائے　　رازِ تقدیرِ الٰہی کو نہ پوچھ

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو　　اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ (المتوفی ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء)، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء) کے خاص مریدین میں سے تھے اور مرشد کو اُن کا یہ شعر بہت پسند تھا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی　　اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی[1]

مجذوبؔ سراپا مجذوب تھے۔ ان کے ایک پیر بھائی نجم احسنؔ نے اُن کے متعلق کہا ہے:

مجذوبیتِ خواجۂ مجذوب ہے جاذب　　اس جذب میں ہے حسنِ خدا داد کا عالم[2]

مجذوبؔ نے بھی وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے۔ مثلاً:-

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے　　تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

آتا ہے نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم　　کیا چھوڑ لیں آنکھیں ہی اب لے حسنِ نظر ہم

مجھے دیکھ آئینہ یار ہوں میں　　جِلا کردۂ دستِ دلدار ہوں میں

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمعِ محفل کی　　پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

---

[1] "ذکر مجذوبؔ"۔ از پروفیسر احمد سعید تھانوی۔ صفحہ ۱۴۴۔ (مطبوعہ لاہور۔ سالِ طباعت درج نہیں)

[2] ایضاً۔ صفحہ ۱۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا حسرت موہانی (المتوفی ۱۹۵۱ء)، حضرت مولانا عبدالوہابؒ (مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے دادا) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے تھے۔ اسی لئے کہا تھا کہ :-

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ — پیرِ بغدادؒ میں ناچار ہوں شیئاً للہ

مولانا بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے :

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار — یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا

اہلِ نظر کو بے خبرِ دو جہاں کیا — ایسی کچھ اک نگاہ وہ دزدیدہ کر چلے

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کر اظہارِ تمنا کر دیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں — تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا؟

ہر طرف بے خودی و بے خبری کی ہے نمود — قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

غرض کہ حسرتؔ نے غزل کی روایات کے ساتھ ساتھ تصوف کی روایات کو بھی قائم رکھا۔ اور یہ لَے ایسی ہے جو کبھی پست نہ ہوئی۔ اور بقول عرفیؔ :-

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

فروری ۷۶ء کے "فکر و نظر" کا خصوصی مقالہ

جہیز کی شرعی حیثیت

مقالے کے اہم نکات : لفظ جہیز کی لغوی تحقیق۔ رسم جہیز کا تاریخی پس منظر۔ مسلمانوں میں جہیز کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی۔ کیا جہیز سنتِ رسولؐ ہے۔ جہیز فقہاء اور محدثین کی نظر میں۔ جہیز ایک معاشرتی خرابی۔ جہیز کے قابلِ اصلاح پہلو۔ اصلاح کے طریقے وغیرہ۔

اس شمارے کے بعض دوسرے مجوزہ مضامین :

مطالعۂ کائنات کا قرآنی نظام حکمت۔ ایران میں مطالعۂ اقبال۔ کتب خانہ خدا بخش خاص/ناضلیہ کے علمی نوادر۔ سر سید کی قومی تحریک۔ اسلامی نظام معیشت۔ شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر۔ محمد علی جوہر کی ادبی شخصیت۔

© rasailojaraid.com